حیاتِ قادر

مؤلف

عبید اللہ دُرَّانی

باب نمبر ۱۷

بچے

یہ ناگپور کا محاورہ ہے کہ مریدین کو بچے کہتے ہیں۔ اہلِ طریقیت تو جہاں تک ہو سکے پیغام حق کو زیادہ سے زیادہ نشر کرنے کے لئے تربیت و اصلاح کے بعد زیادہ سے زیادہ مریدین بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور ضرور مریدین بھی کافی حد تک اس رشد و ہدایت سے مستفید ہوتے ہیں۔ مگر اہلِ حقیقت میں یہ دیکھا گیا ہے کہ اپنے تمام ایامِ ظہور میں دو چار، آٹھ دس سے زیادہ صحیح معنی میں مرید نہیں بناتے۔ آپ خود سوچئے کہ آپ کے چار چھ بچے بھی ہوں تو ان کی پرورش کا بوجھ، ان کی نشو و نما کی ذمہ داری، ان کے دُکھ سُکھ کے اثرات۔ یہ سب کتنا بڑا بوجھ ہوتا ہے۔ پھر یہ تو دنیا کے بچے ٹھہرے۔ محبت اور تعلق اپنی جگہ صحیح مگر جب وہ جوان ہو جاتے ہیں تو آپ کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے اور بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ لیکن روحانی بچے تو وہ ہیں جن کی ذمہ داری قیامت تک ختم نہیں ہوتی۔ ان کی روح کی تولید بچپن میں ماں باپ کی طرح دودھ دینا۔ اپنے ہاتھوں سے نرم نرم صحت آور غذائوں کا کھلانا، صحیح تعلیم و تربیت۔ کبھی شفقت تو کبھی سختی۔ پھر جب جوان ہو جائیں تو اپنے پیروں پر کھڑا کرنا۔ اور کوئی خدمت ان کو سپرد کرنا۔۔ انفسی اور آفاقی تلاطم سے ان کی حفاظت کرنا اور طریقت کے راستہ پر دل کو ذاکر کر کے کسی اسم کا بخش دینا کہ تم کمائو اور کھائو۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ آخری وقت میں جس کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ دست گیری کر کے باایمان اس دنیا سے اُٹھانا۔ پھر قبر کی حالت اور روحانی زندگی میں تا قیامت اپنے سایہ میں رکھنا اور حشر میں شافع اُمم کا دامن تھما دینا۔ اور اللہ جانے ان ذمہ داریوں کے علاوہ کیا کیا اور۔ کس کا حوصلہ ہو سکتا ہے، یہ کون کر سکتا ہے۔ حقیقت کے راستہ میں مرید کرنا کوئی کھیل نہیں۔ آخر کیوں کوئی کسی کی ذمہ داری لے اور وہ ذمہ داری جو شاید کروڑوں سالوں میں بھی ختم نہیں ہوتی۔ آپ خود سوچئے چاہے آپ کتنے ہی خوش حال کیوں نہ ہوں۔ کوئی یتیم غریب بچہ آپ کے پاس آتا ہے اور اپنی غم پرورد آنکھیں آپ کی طرف اُٹھا کر آپ سے یہ درخواست کرتا ہے کہ میرا دنیا میں کوئی نہیں۔ مجھے آپ اپنا بچہ بنا لیجئے۔ آپ کو رحم ضرور آتا ہے اس کو کھانا بھی کھلا دیں گے۔ کپڑے بھی پہنا دیں گے اور کچھ روپیہ بھی دے دیں گے۔ مگر یہ کہہ دیں گے۔ جائو بیٹا دنیا وسیع ہے۔ اللہ مالک ہے۔ ذمہ داری سے کترا جائیں گے۔ بیٹا بنانے کا حوصلہ نہ ہو گا۔ یہ تو صرف دنیا کی ذمہ داری ہے۔ چار دن کی بات ہے۔ اسی سے آپ گھبرا جاتے ہیں۔ پھر سوچئے کہ اس ابدی ذمہ داری کو کوئی کیوں قبول کرے۔

مگر واہ رے تیری شان۔ واہ رے تیرا ظرف۔ سمندر کو اس کی کیا پروا کہ کتنے نالے ندیاں مجھ میں آکر گرتے ہیں۔ ان چیزوں سے نہ سمندر میں کمی ہوتی ہے، نہ زیادتی۔ یہی حال وجے نگرم کے دربار کا دیکھا گیا ہے۔ یہ دولتِ سرمدی جس کے لئے بادشاہوں نے اپنی سلطنتیں چھوڑ دیں۔ جس کے لئے فقیر چالیس چالیس سال کمروں میں بند ہو کر دن رات ریاضتوں میں لگے رہے۔ وہ موتی وہ گوہر جس کی قدر شاہ بداند یا بداند جوہری، ایسے بکھیرے جاتے ہیں، جیسے مرگ کے آگے دانے۔ مگر معلوم نہیں اس میں نصیبوں کا دخل ہے یا کوشش پیہم کا کہ ان ہزاروں میں سے جن کو یہ دولت مفت تقسیم کی جاتی ہے، کوئی ایک اس کو پکڑ لیتا ہے، اپنا لیتا ہے۔ پھر اسے بہت کچھ ہی نہیں سب کچھ مل جاتا ہے۔ وہ مقامات اور منزلیں، وہ آزمائشیں اور ریاضتیں جو اگلے زمانوں میں بیس بیس سال کی سخت کوشی سے کرم اور توجہ کے بعد طے ہوتی تھیں وہ چٹکی بجانے میں طے ہوتی ہیں۔ مگر وائے زمانہ اس کے قدر دان بہت کم ہیں۔

باباوقار اولیا چاروں سلسلوں میں بیعت فرماتے ہیں۔ جس کو جیسے دیکھا اسی کے مطابق اس کی بیعت فرمایا۔ چشتیہ سلسلہ تو عام ہے۔ اس میں ذات پات کی کوئی قید نہیں مگر قادریہ سلسلہ میں بہت احتیاط برتی جاتی ہے اور عام لوگوں میں سے صرف کلمہ گو کی قادریہ سلسلہ میں بیعت کی جاتی ہے۔ جب ان کی پوری تعلیم وتربیت ہو چکی ہوتی ہے۔ اور ان کے خون میں بھی کچھ جوش ہوتا ہے تو ان دونوں سلسلوں کے مابین نقش بندیہ اور سہروردیہ سلسلہ میں بھی بیعت کی جاتی ہے۔ غرض جس کو جس قابل سمجھا جاتا ہے یا جیسی نظر کرم اور جیسا لطف وعنایت ہو۔ بعض لوگوں کو چاروں ہی سلسلے بخشے جاتے ہیں۔ عام لوگوں میں سے کسی کو کوئی سلسلہ عطا ہوتا ہے کسی کو کوئی۔ ایسے فقیر جو کسی خاص سلسلہ سے پہلے ہی سے وابستہ ہوں اور صاحبِ نسبت بھی ہوں ان کی اسی راستہ پر دست گیری کی جاتی ہے جس پر وہ پہلے سے ہیں۔ اور ان لوگوں کو ان کے مقامات اپنے لطف وکرم کی گود میں لے کر طے کرا دیتے ہیں۔

ذیل میں چند بچوں کا ذکر درج ہے۔ اس میں ہر بچہ کا ذکر اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل مختلف ہے۔ اب خدا جانے یہ لوگ کہاں ہوں اور کس حالت میں ہوں اس کا علم تو اسی کو ہو گا۔ جو ان کا بوجھ اُٹھا رہا ہے۔

۱۔ پانی والے بابا:

نام محمد عثمان حافظِ قرآن تھے۔ عمر چالیس کے لگ بھگ ہو گی تار محمد ایوب کمپنی کے وجے نگرم کے ایجنٹ تھے۔ متمول تھے۔ تین ہزار روپیہ سالانہ تنخواہ اور خرچ ملتا تھا۔ ۲۲ء یا ۲۴ء کا ذکر ہے۔ جبکہ بابا قادر قبلہ ناگپور سے لوٹ کر ان چٹانوں پر چھوٹی سی کٹیا میں تھے۔ اور چاروں طرف خوفناک جنگل باباصاحب کی خدمت کے لئے ایک سردار نامی شخص بچپن کا ساتھی تھا۔ عثمان صاحب اس زمانہ میں روزانہ بعد نماز فجر کچھ کھجور ساتھ لے کر سائیکل پر آتے اور جھونپڑی کے باہر انتظار کرتے۔ جب باباصاحب باہر نکلتے تو

عثمانی صاحب کھجوریں پیش کرتے۔ بابا صاحب ان میں سے ایک یا دو کھجور اُٹھا لیتے اور عثمان صاحب باقی کھجوریں لے کر واپس شہر چلے جاتے۔ روزانہ کا یہ دستور، چاہے کوئی بھی موسم ہو بلاناغہ ایک سال سے زیادہ جاری رہا۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ عثمان صاحب نے قبلہ بابا صاحب سے عرض کیا کہ حضور میں اللہ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ بابا صاحب نے فرمایا کہ تم تاب نہیں لاسکتے۔ کچھ اور مانگو۔ جب بہت اصرار کیا تو فرمایا کہ خیر تم چالیس دن کے اندر اندر دیکھ تو لوگے مگر پا نہ سکو گے۔ کسی فقیر کے روپ میں ملاقات ہو گی۔ دیکھو چُوک نہ جان۔ محمد عثمان صاحب روزانہ راہ دیکھتے رہے اور ہر آنے جانے والے کی صورت کو تکتے رہے۔ مگر دل نے کبھی گواہی نہ دی کہ وہ یہی ہیں۔ آہ و دل کی تڑپ اور وہ انتظار کی گھڑیاں ہر آہٹ پر کان، ہر پرچھائیں پر آنکھ جمائے ہوئے۔ اسی طرح پورا ایک مہینہ گزر گیا۔ روزانہ حسب معمول قبلہ سے ملاقات ہوتی رہی مگر اس بات کا کوئی ذکر نہ آیا۔ ایک مہینہ کے بعد انتہائی مایوسی میں عرض کی کہ حضور ایک مہینہ بیت گیا۔ کوئی بھی نہ ملا۔ بابا صاحب نے فرمایا۔ ”جا ملاقات ہو گی۔“ اسی طرح روزانہ باقی ۹ دن تک ایک مایوسانہ شکایت، اُدھر سے اطمینان کا جواب۔ انتالیس دن کے بعد عثمان صاحب نے عرض کیا کہ حضور چالیس دن ہو گئے ہیں۔ حکم ہوا۔ ”جا آج رات ضرور ہو گی۔“ پھر ایک امید کی لہر عثمان صاحب میں دوڑی اور گھر چلے گئے۔ رات کو معمولات سے فراغت پا کر تقریباً ۱۲ بجے وہ اپنے کمرہ میں موجود دوسری منزل پر آرام کر رہے تھے۔ اور ربِ ذوالجلال کے نقشے تصور میں گھوم رہے تھے۔ کمرہ ہر طرف سے بند تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بوڑھا فقیر شانے پر کمبل، ہاتھ میں لکڑی لئے پائنتی پر کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے بابا میں بھوکا ہوں۔ ایک پیسہ خیرات کا دے دو۔ عثمان صاحب کو ان پر سخت غصہ آیا کہ یہ کون مسافر ہے جو اتنی رات گئے میری آرام گاہ میں گھس آیا ہے۔ اپنے ملازموں کو آواز دی کہ اسے باہر نکال دو۔ فقیر نے کہا۔ ”بابا خفا کیوں ہوتے ہو۔ دیکھنا کیا ہے مجھے ایک پیسہ دے دو میں خود چلا جاؤں گا۔“ فقیر کی اس ہٹ پر عثمان صاحب کو بہت غصہ آیا۔ اور وہ چارپائی سے اُٹھ کھڑے ہوئے تاکہ فقیر کو باہر دھکا دے کر نکال دیں۔ اس پر فقیر دروازہ سے باہر چلا گیا۔ عثمان صاحب غصہ کی حالت میں اس کے پیچھے پیچھے دوازے کے پاس آئے تو فقیر ندارد اور دروازہ اندر سے بند پھر بھی انہوں نے اس بات پر کوئی توجہ نہ کی اور دروازہ کھول کر باہر آئے تو دیکھا کہ نوکر آرام کر رہے ہیں۔ اور صدر دروازہ بھی اندر سے مضبوطی سے بند ہے۔ ملازم کریم خان کو بیدار کر کے اس سے دریافت کیا کہ وہ فقیر کدھر گیا۔ نوکر نے پریشان ہو کر کہا۔ حضور یہاں کوئی نہیں آیا۔ دروازہ دیکھئے کتنی احتیاط سے بند ہے۔ عثمان خان صاحب اور ملازموں نے سارے مکان کی تلاشی لی مگر فقیر کا کچھ پتہ نہ چلا۔ کچھ شک اور کچھ حیرت کے عالم میں عثمان صاحب اپنے پلنگ پر آکر لیٹ رہے اور اس قصہ کو بھول گئے۔ صبح سویرے حسب معمول کھجوریں لے کر بابا صاحب قبلہ کے پاس حاضر ہوئے اور پھر شکایت کی کہ حضور چالیس دن بھی ہو گئے۔ آپ کی بات تو پکی تھی مگر آج بھی کچھ نہیں ہوا۔ بابا صاحب قبلہ پر جلال طاری ہو گیا۔ اور ایک بہت بڑی گالی دے کر جھڑک کر کہا کہ اَے بدبخت وہ خود تیرے پاس آیا تھا اور

کہا کہ بھوکا ہوں ایک پیسہ دے دو۔ مگر تو نے جھڑک کر نکال دیا۔ یہ سننا تھا کہ عثمان صاحب آہ کا نعرہ لگا کر بے ہوش ہو گئے۔ اور زمین پر گر پڑے۔ سردار کو شہر بھیج کر ان کے رشتہ داروں کو بلوایا گیا۔ وہ لوگ عثمان صاحب کو اُٹھا کر لے گئے۔ وہ چھ ماہ تک اس بے ہوشی کے عالم میں پڑے رہے اس کے بعد ان کے ایک رشتہ دار ان کو اپنے وطن بھلاوا کاٹھیاواڑ لے کے چلے گئے۔

آج کل بھی محمد عثمان بالکل برہنہ لیٹے رہتے ہیں۔ کسی سے بات چیت نہیں کرتے۔ چاروں طرف پانی کے گھڑے رکھے رہتے ہیں۔ جو حاجتمند آتا ہے ان کو ان گھڑوں سے پانی دے دیا جاتا ہے۔ اگر کسی گھڑے میں عثمان صاحب خود ہاتھ ڈال دیں یا تھوک دیں تو میمن لوگ اس پانی کو نیلام کرتے ہیں اور ہزاروں روپے میں فروخت کرتے ہیں کہ لاعلاج امراض میں یہ پانی تیر بہدف کام کرتا ہے۔ آج کل محمد عثمان پانی والے بابا کے نام سے مشہور ہیں اور ان کے فیض کا چشمہ جاری ہے۔

۲۔ محبوب علی:

یہ آمین آباد ضلع گنٹور کے رہنے والے تھے۔ ۱۳۳۲ھ میں وجے نگرم آئے تو اس وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔ خاندانی پیشہ لحاظ سے سنگ تراش تھے اور نہایت تندرست، بے انتہا محنتی اور بظاہر ایک اچھے اور صالح نوجواں نظر آتے تھے۔ نہ معلوم ان کے دل کا کیا راز تھا اور انہیں کیا جستجو تھی۔ ۱۳۳۲ھ میں اپنے قبلہ کے ساتھ پتھر کے کام کے سلسلہ میں یہ وجے نگرم آئے تو اوروں کے ساتھ یہ بھی سلام کے لئے بابا صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بابا صاحب کا چہرہ دیکھ کر بے ہوش ہو گئے۔ سارے کام اور دنیا کے دھندے ختم ہو گئے۔ دن رات سر بزانو پڑے رہتے تھے۔ سوکھ سوکھ کر کانٹا ہوتے گئے اور ۱۳۷ھ میں وصال ہو گیا۔ مزار آمین آباد میں ہے اور اس مٹی کے ڈھیر سے فیض کا چشمہ جاری ہے۔

آج جلوس کا دن ہے۔ یعنی بابا صاحب قبلہ کی پیدائش کا دن۔ قبلہ عالم تیار ہو کر دربار عام میں رونق افروز ہونے والے ہیں۔ نہ معلوم کتنے فقراء اور عشاق آنکھیں فرش راہ کئے دیدار کے منتظر ہیں۔ اہلِ بصیرت یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ملائکہ کے ہجوم صف باندھے کھڑے ہیں اور حوریں پنکھا جھل رہی ہیں۔ حضور ابھی ڈیوڑھی کے اندر ہی ہیں کہ گنٹور والے شہنائی ساز ان ہی محبوب علی کی یاد میں ایک راگ چھیڑتے ہیں۔ اللہ رب ذوالجلال ایک تیر کی طرح شہنائی کی آواز دل کے پار ہو جاتی ہے۔ قبلہ عالم سر پر دونوں ہاتھ رکھے بالکل ساکت کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آنکھوں سے آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے ہیں۔ محبوب علی کی یاد میں آنسو تو نہیں مگر شبنم کی ایک چادر سی دونوں پلکوں کے درمیان ہے۔ غم و ترنم جو عشق کی حیات ہے جو سمندر سے بھی گہرا ہے۔ جس کی آبرو اور رعفت موتی کی آب سے کہیں زیادہ لطیف اور دل آویز ہے۔ آپ کی آنکھوں سے نمایاں ہے۔ شہنائی بج رہی ہے۔ قلبِ عاشق مصروف دیدار ہے۔ آہ محبوب تو کون تھا۔ آسمان کے تارے جو ایک دن میں اپنی چمک دکھا کر زمین پر ٹوٹتے ہیں، تیرے

پائوں کی گرد ہیں۔ بچپن سے تو نے ماں باپ کے ساتھ پہاڑوں اور چٹانوں میں اپنے دن گزارے۔ وہ بڑی بڑی چٹانوں کی ہیبت اور وحشت، وہ دن کی تپش اور راتوں کا خوف تیرے ننھے سیدل کو سہائے ہوئے تھا۔ بڑی بڑی چٹانوں کو بارود کے دھماکے سے پھٹتے دیکھنا۔ پھر فولاد کی چوٹ سے ان کا ٹکڑے ٹکڑے کیا جانا اور دیکھتے ہی دیکھتے بڑے بڑے پہاڑوں کا انسان کے تصرف میں آجانا تجھے حیرت میں ڈالے ہوئے تھا۔ تو چٹانوں میں پلا، تیری طاقت تیری ہمت تیرا عزم و ارادہ، تیرا دل خود ایک بہت بڑی چٹان تھا۔ تیری روح کی کشش ازلی گم کردہ آہو کی طرح ان چٹانوں میں بھٹکتی پھرتی تھی۔ تجھے خود معلوم نہ تھا کہ تو کیا چاہتا ہے۔ تیری روح اس بات کی متلاشی تھی کہ اپنی ہستی کو کسی کے پائے ناز پر پاش پاش کر دے۔ تو نے دنیا کے فریب اور رنگینیاں دیکھی ہی نہ تھیں۔ تو زندگی اور موت کے راز سے ناواقف تھا۔ حسن و عشق کے قصوں سے ناآشنا تھا۔ قسمت کسی بہانے سے تجھے اپنے مرکز حیات پر لے آئی۔ ایک دید کافی تھی۔ موسیٰؑ کو تو پھر بھی ہوش آگیا۔ مگر تجھے دائمی مدہوشی نصیب ہوئی طور جل کر سُرمہ سُرمہ ہو گیا تھا۔ مگر تیرا قلب پگھل کر پانی پانی ہو گیا۔

آہ محبوب! شہنائی کا سہنہ بھی چھدا ہوا ہے۔ مگر اس میں وہ ظرف کہاں۔ جو تیرے دل کا راز افشا کر سکے۔ حضور بابا صاحب کی آنکھیں آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہیں۔ ایک شبنمی چلمن پتلیوں پر پڑی ہوئی ہے۔ اس چلمن کو کون اُٹھائے اور ان کے دل کے بھید کون پائے۔

۳۔ فرید مستان:

آپ وجے نگرم کے باشندے تھے۔ بیوی بچوں والے تھے۔ اور تمباکو کی دکان کرتے تھے۔ آپ غیر مسلم قوم تھے۔ اور سیدھے سادے خاموش نوجوان تھے۔ بظاہر آپ میں کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی تھی۔ آپ کے خاندان میں سات نسل پہلے راجہ کے یہاں کمانڈر انچیف تھے۔ جن کی بیوی نے راجہ سے اپنی عصمت بچانے کے لئے خاوند سے اپنا گلا کٹوایا تھا۔ پھر راجہ کو خواب میں کہا کہ تیری چھ نسل تک مرد اولاد نہ ہو گی۔ ساتویں میں ہو گی۔ جب کوئی مرد حق قدم رکھے گا۔ چنانچہ اس وقت ہوا جب بابا فرید پیدا ہوئے۔ آپ کے والد راجہ کے یہاں ملازم تھے۔ گیارہ سال کی عمر سے ہی بابا فرید مستغرق رہا کرتے تھے۔ ۲۴ء میں جب ایک کٹیا ڈال کر حضور بابا صاحب نے میٹے پر مستقل قیام فرمایا تو یہ آپ کے پاس آنے جانے لگے اور تھوڑے عرصہ بعد گھر ترک کر کے خادموں کے زُمرے میں شامل ہو گئے۔ یہ بہت محنتی اور گم گو تھے۔ جنگل سے لکڑی کاٹ کر لانا اور بابا صاحب کے غسل کے لئے پانی گرم کرنا آپ نے اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ اور تقریباً ۱۲ سال اسی خدمت پر رہے۔ یہ زمانہ غربت و تنگی اور خطرات کا تھا۔ صبر و رضا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی گھٹی میں پڑا ہے۔ چونکہ آپ اور خادموں سے زیادہ بات چیت نہ کیا کرتے تھے اور کبھی بھی بغیر بلائے

ہوئے لنگر خانے سے جا کر کھانا نہیں مانگتے تھے۔ اس لئے جان بوجھ کر خادم ان کو بار بار فراموش کر دیتے تھے۔ لیکن کبھی آپ کے چہرہ سے یہ ظاہر نہ ہوتا تھا کہ آپ کو کئی دن سے کھانا نہیں ملا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ستانے کے لئے کتوں سے بچا ہوا جھوٹا آپ کے سامنے رکھ دیتے۔ آپ بخوشی اسی کو کھا لیتے۔ مزاج میں انتہائی تحمل اور یکسوئی ہمیشہ سے تھی اور جب ان صفات کو ایک رُخ مل گیا تو پھر کیا تھا۔ ممکن ہے ان ہی وجوہات کی بناء پر آپ کا نام بدل کر بابا صاحب نے فرید مستان رکھا۔ غالباً مزاج کے اس تحمل و سکون کی وجہ ہی سے آپ کے پورے زمانہ خدمت میں یا اس کے بعد کبھی بھی ایک جذب کی پھریری تک کسی نے نہ دیکھی۔ جب آپ کی تعلیم مکمل ہو چکی اور آپ کو تیار کر دیا گیا تو بابا صاحب سے ایک خرقہ عنایت ہوا اور حکم ملا کہ تم مچھلی بندر (یعنی مسولی پٹم، جو وجے نگرم سے تین سو میل کے فاصلہ پر ہے) چلے جائو۔ قیام کی جگہ بشارت کے ذریعہ بتا دی جائے گی۔ آپ کو ریل کا ٹکٹ دے کر گاڑی میں سوار کر دیا گیا۔ آپ تن تنہا وہاں پہنچے۔ راستہ ہی میں اس جگہ کا جہاں آپ کو قیام کرنا تھا، منظر آنکھوں کے سامنے آیا۔ اور نقشہ دماغ میں جم گیا۔ آپ مچھلی بندر پہنچ کر اس جگہ کی تلاش میں گھومتے رہے۔ وہ جگہ کہیں آبادی سے بہت دور تھی۔ شام کے وقت تھک کر شہر کے باہر ایک پُلیا پر بیٹھ گئے۔ آدھی رات کے قریب ایک پولیس والے نے کوئی آوارہ سمجھ کر آپ کو حوالات میں بند کر دیا۔ صبح کو جب دیوان جی تفتیش کے لئے آئے تو انہوں نے آپ کو پہچان لیا کہ وجے نگرم دربار کے خادم ہیں۔ تقریباً چوبیس گھنٹہ کے بھوکے پیاسے تھے۔ دیوان جی نے خوب خاطر کی۔ چائے پلائی اور عزت کے ساتھ روانہ کر دیا۔ آپ پھر اپنی جگہ کی تلاش میں نکل پڑے۔ پورے تین دن ہو گئے۔ اس دوران میں نل سے پانی ضرور پی لیا کرتے تھے۔ مگر کھانا کون دیتا۔ آپ شہر سے مشرق کی جانب سمندر کے ساحل کے قریب کھیتوں میں سے گزر رہے تھے کہ ایک گوالے نے جس کے کچھ کھیت بھی وہاں تھے، آپ کو دیکھا اور ایک پکی ہوئی پھوٹ آپ کو دی کہ اسے کھالو۔ آپ نے اسے کھالیا اور آج تک اس واقعہ کو یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اتنی لذیذ غذا میں نے عمر بھر نہیں کھائی اور اس احسان کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس کھیت کے قریب ایک اجڑا ہوا گائوں ہے۔ یہاں پر ایک پرانا مندر بھی ہے۔ اس گائوں کے گرد ناگ پھنی اور دیگر جنگلی جھاڑیاں بہت تھیں۔ اس مندر کے قریب ایک ذرا سی جگہ میں فرید مستان نے قیام کیا۔ وہی گوالہ جو اسی گائوں کا رہنے والا تھا آپ کے لئے کبھی کبھی تھوڑے سے اُبلے ہوئے چاول لا دیتا۔ جس پر بسر اوقات ہونے لگی۔

اللہ رے شانِ توکل، نہ یہ معلوم کہ کرنا کیا ہے نہ یہ کہ رزق کہاں سے آئے گا، رہنا کیسے ہو گا۔ مگر جب دیکھا کہ یہ جگہ اس بشارت کی تصدیق ہے تو وہیں بیٹھ رہے۔ پیر کا حکم سب کچھ ہے۔ مگر مریدین سے بھی اس پر آمنا و صدقنا کہنے والے کتنے ہوتے ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فرید مستان لبِ ساحل ٹہل رہے تھے کہ ایک نوجوان کپڑے اُتار کر سمندر میں کودنے کا ارادہ کر رہا تھا پہلے تو آپ کو یہ خیال آیا کہ شاید تیرنے کی غرض سے کود رہا ہے۔ مگر دل نہ مانا تو اس کو بلوا کر اس کا سارا ماجرا پوچھا۔ وہ کوئی

پولیس انسپکٹر تھا جو مشکلات میں گھر گیا تھا۔ اور خودکشی کی غرض سے آیا تھا۔ فرید بابا نے اس کے لئے دعا کی اور یہ فرمایا کہ تم واپس جائو، تمہاری ساری مشکلات بہت جلد دور ہو جائیں گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس بات کی شہرت ہوئی تو گویا یہ مقام شہر سے کوئی دو تین میل دور ہے اور راستہ بہت ہی خراب ہے، یہاں تک کہ بیل گاڑی کا بھی گزر مشکل ہے۔ پھر بھی لوگ آہستہ آہستہ رجوع ہونے شروع ہو گئے۔

آج اس جگہ نہایت عالی شان مرمریں فرش کا ایک حجرہ بنا ہوا ہے اور دربار لگا ہوا ہے۔ بڑے چھوٹے، غریب امیر، ہر قوم کے لوگ آتے ہیں اور مرادیں پوری ہونے کی دعا لے کر جاتے ہیں۔ بابا فرید مستان نے اپنے پیر کی سنت اختیار کی ہے۔ وہی بیٹھنے کا طریقہ، وہی ہر ایک کی داستان میں گہری دلچسپی، وہی یقین اور اطمینان کے ساتھ دعا اور پیام کامیابی، چہرہ پر وہی منانت اور مسکراہٹ ، پیشانی پر وہی فراست اور سکون۔ اللہ اللہ پیر کا کرم اور توجہ ہو تو عشق بھی کیا چیز ہے۔ عبد کو معبود بنا دیتی ہے۔

کچھ دنوں اور تصور مجھے کر لینے دے

رفتہ رفتہ تیری تصویر بنا جاتا ہوں

۴۔ عبد الرحمن بابا:

آپ دانم باڑی میسور کے رہنے والے تھے۔ اور پڑھے لکھے نوجوان تھے۔ دانم باڑی وہ جگہ ہے جہاں بہت متمول تاجر رہتے ہیں اور زیادہ تر آبادی مسلمانوں کی ہے۔ یہ جگہ مولویت کا مرکز ہے اور ایسے شدید قسم کے مولوی یہاں ہیں جو ہر بات پر کفر کا فتویٰ دے دیتے ہیں گویا یہ جگہ خشک ظاہر پرست مولویوں کا اڈہ ہے۔ مگر چاہے کتنا ہی انسان بھاگے اور ظاہر داری کے پردوں سے اپنے دل کی کرید کو ڈھانکنے کی کوشش کرے۔ پھر بھی سسک تو دل میں ہوتی ہی ہے دانم باڑی وجے نگرم سے تقریباً ایک ہزار میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں سے کچھ لوگ بابا صاحب کا نام سُن کر وجے نگرم آئے تھے اور فیض یاب ہو کر لوٹے تھے۔ ان ہی کے ذریعہ عبد الرحمن بابا نے ہمارے بابا صاحب کا نام سُنا اور ان کے دل نے فوراً گواہی دی کہ تیری عمر بھر کی تلاش کا پھل وہیں ملے سگا۔ دیوانہ وار آپ وجے نگرم پہنچے اور خدام میں داخل ہو گئے۔ بڑے جونیلے نوجوان تھے۔ مصالحہ تیار تھا۔ بھک سے آگ لگ گئی۔ بابا قادر کے دربار میں آپ زیادہ تر جذب کی حالت میں رہنے لگے۔ آپ مدہوش تو نہ تھے مگر انتہائی ہوش تھا۔ دو تین سال کا عرصہ گذر جانے کے بعد ایک دفعہ آپ نے رات کے وقت ایک ہاتھ میں رسی اور ایک ہاتھ میں چھرا لیا اور حجرۂ مبارک کے گرد طواف شروع کیا۔ کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ انہیں روکا جائے۔ آپ یہ کہتے تھے کہ آج یا تو نہیں یا میں نہیں۔ غالباً ہر دم کی آگ میں جلتے اور سلگتے

رہنے سے عاجز آ گئے تھے۔ تابِ صبر باقی نہ رہی۔ وصل سے ہی یہ آگ بجھ سکتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے دل نے یہ کہا کہ جب تک جسم کا ناپاک پردہ موجود ہے حق سے وصل کا امکان نہیں۔ اسی لئے وہ آج اپنی طبیعت کی شدت کے میلان کے مطابق یہ طے کر کے آئے تھے کہ اس پردہ کو چاک کر دیا جائے۔ مگر بھلا پیر کامل ایسے دائوں میں کب آتا ہے اس کو تو نہ آپ اپنی جان کی رشوت دے سکتے ہیں اور نہ اس کی جان کی دھمکی۔ وہی ہوتا ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔ اپنے چاہنے اور نہ چاہنے کا اس میں دخل نہیں۔ پیر اور مرید کے درمیان خدا جانے کیا ہوا۔ مگر دیکھنے میں یہ آیا کہ تھوڑی دیر میں رحمن بابا ٹھنڈے ہو گئے اور آپ کو وطن جانے کا حکم ملا۔ آپ کچھ دن دانم باڑی میں ٹھہرے۔ وہاں مولویوں سے سخت جنگ رہتی تھی۔ آپ ٹھہرے رند بے باک۔ راز کی بات بغیر تکلف اور تاویل کے فرمادیا کرتے تھے۔ مولوی لوگ بھلا اس کو کیسے گوارا کرتے۔ ان میں جو سمجھ دار بھی تھے۔ وہ شریعت کے پردہ کی بے حرمتی پر خفا تھے غرض کہ کچھ دنوں ہی میں آپ کی جان کے لالے پڑ گئے، مگر آپ نڈر تھے۔ کچھ عرصہ ڈٹے رہے۔ اس کے بعد میسور تشریف لے گئے وہاں بھی لوگوں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ کسی الزام میں آپ پر مقدمہ قائم کر کے قید کروادیا۔ اس زمانہ میں ایک دُرسوامی نامی نوجوان آپ کا خادم تھا۔ یہ فوج میں سگنل انسٹرکٹر تھا۔ قید سے رہائی کے بعد آپ بہت بیمار ہو گئے یہاں تک کہ بخار کی شدت سے بیہوشی طاری ہونے لگی۔ آپ نے دوستوں سے درخواست کی کہ مجھے وجے نگرم پہنچادو۔ ایک ٹکٹ آپ کی جیب میں ڈال دیا گیا اور آپ کو گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ آپ تقریباً بیہوشی کی حالت میں مدراس تک پہنچے۔ مدراس میں ریل بدلتی تھی۔ غالباً قلیوں نے رحم کھا کر آپ کو اُٹھا کر وائی زیگ کی گاڑی میں ڈال دیا۔ وائی زگ پہنچے۔ وہاں پھر گاڑی بدلتی تھی۔ معلوم نہیں کن لوگوں نے اُٹھا کر آپ کو پلیٹ فارم پر ڈال دیا۔ آپ میں اتنی بھی سکت نہ تھی کہ بات کر سکیں۔ وہاں کے کسی باشندے نے آپ کو پہچانا اور ساتھ لے کر آپ کو دجے نگرم پہنچادیا وجے نگرم میں ایک جھونپڑی میں رہنے کا حکم ہوا۔ آپ کو اب بھی یہ اصرار تھا کہ مجھے اجازت دے دو۔ یہ جسم کا پردہ مجھ پر بھاری ہے۔ مگر بار بار سمجھا اور منا کر حضور بابا صاحب نے یہی تلقین کی کہ تم صبر کرو صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ مگر انہوں نے نہ مانا۔ ایک دن جب بابا صاحب دیکھنے کے لئے تشریف لائے تو ہاتھ بڑھایا۔ مصافحہ کیا اور جاں بحق ہو گئے۔

آپ کا مزار مبارک اسی دربار کی شمالی سمت بنا ہوا ہے۔ ہر سال بڑے اہتمام سے عرس ہوتا ہے اور نیاز ہوتی ہے۔ ہزاروں لوگوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ خوش نصیب ہے وہ عاشق جس کو اپنے پیر کے قدموں میں آخری سکون نصیب ہو۔ اور مبارک ہے وہ روح جس کی تلاش کو مرشد کے دامن میں آسودگی میسر ہوئی ہو۔

۵۔ مقبول شہید:

یہ ایک نوجوان بیس اکیس سال کی عمر ہو گی۔ بیوہ ماں کے بڑے لڑے تھے۔ متمول خاندان اور پڑھے لکھے تھے۔ عرق النساء کے درد کے سلسلہ میں دربار تشریف لائے۔ وہ درد تو اپنی جگہ دردِ عشق میں تبدیل ہو گئے۔ ان کی ایک عزیزہ نے ان کا چہرہ دیکھ کر کہا۔ ''کیا بات ہے مقبول تم تو مانجھے کی دلہن معلوم ہوتے ہو۔'' ایک اور عزیز نے جواب دیا۔ ''ابھی کیا ہے۔ جب مہندی لگے گی تب دیکھنا اور یہ شعر پڑھا۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا

ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی تھا

یہ شعر مقبول صاحب کے دل پر کچھ ایسا لگا کہک رات دن اسی شعر کو گاتے رہتے۔ چند دن کے بعد حکم ہوا کہ تم واپس اپنی والدہ کے پاس چلے جائو۔ رات پہنچے، صبح وصال ہو گیا۔ آنکھوں سے تازہ خون جاری تھا۔ جو قبر میں اتارنے کے بعد بھی بند نہ ہوا۔ ایک بزرگ جنہوں نے قبر میں اتارا فرماتے ہایں کہ شہید حق ہے۔

لئے پھرتی ہے بلبل چونچ میں گُل

شہید ناز کی تربت کہاں ہے

٦۔ رحیم خان بابا (تنالی والے):

اکیس سال قبل باباجان کے دربار میں اپنی مریضہ بیوی کو لے کر آئے تھے۔ پہلے فرید مستان بابا کے پاس پہنچے تھے۔ پھر بابا جان کے پاس حاضر ہوئے تھے۔ پہلی بار چار ماہ پندرہ دن رہ کر چلے گئے تھے۔ دوبارہ ایک سال بعد اکیس دن کے لئے آئے تھے۔ اس وقت اجازت ملی تھی۔ جا کر تنالی میں قیام کیا اور خدمت خلق میں لگے رہے۔ اس کے بعد پانچ دفعہ اور شرفِ حاضری نصیب ہوا۔ آخری بار حاضری کا یہ نظارہ تھا کہ جب حضور باباجان دربار میں تشریف لائے تو رحیم خاں بابا دربار کے ایک گوشہ میں باادب کھڑے تھے۔ حضور نے تخت پر جلوہ افروز ہونے سے پہلے اس جانب نظر کی اور فرمایا 'رحیم خاں' تو مرید صادق نے ہاتھ جوڑ لئے۔ تاب سلام یا تاب قدمبوسی اس فدائے دیدار کو کہاں تھی۔ تبرک لینے کے لئے بھی لائن سے ہٹ کر اس جگہ جا کر باادب کھڑے ہو گئے جہاں پر جذامی کھڑے ہوتے ہیں۔ حضور کا دست مبارک جب رحیم خاں بابا کی طرف کشادہ ہوا تو رحیم خاں بابا نے دور ہی سے ہاتھ بڑھا کر

نہایت ادب کے انداز میں تبرک لیا۔ اور خاموشی سے پیچھے کی جانب آکر دربار میں بیٹھ گئے۔ اس کا یہ صلہ ملا کہ اسی شب رات کے دو بجے قیام گاہ کے پائیں دروازہ سے اندر بلائے گئے اور شرفِ باریابی خاص عنایت ہوا۔

رحیم خاں بابا شدتِ عشق کی جیتی جاگتی نشانی تھے۔ جب اجازت ملی تھی اس وقت بھی جذبات میں ہیجان و شدت تھی اور اس آخری بار سئہ میں بھی۔ اگرچہ اوپر سے سکون سمندر نظر آتا ہے۔ مگر اندون قلب و روح میں ایک طوفانِ عظیم اُٹھا ہوا تھا۔ چنانچہ عرصہ قادر نگر میں قیام کرنے کے بعد یہیں پردہ فرمالیا۔ خوش نصیب ہے وہ انسان جو پیش یار ہی پروان چڑھے۔ بچوں میں رحیم خاں بابا ہی وہ پہلے شہید ہیں جنہیں لال میٹہ کے دامن میں جگہ ملی۔ لال میٹہ وہ مقام مقدس ہے۔ جس پر خود حضور باباجان نے ایک سال بعد آرام فرمایا۔ رحیم خاں بابا کا ساتھ دینے کے لئے ان جیسا مزاج رکھنے والے دوسرے شہدی حق شکور بابا تھے جو حضور باباجان کے وصال کے بعد پردہ فرما کر باباجان کے قدموں میں پہاڑی کے نیچے کے دامن میں رحیم خاں بابا سے جاملے۔

رحیم خاں بابا کی شدت عشق کا اندازہ ان کے اقوال سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ فرماتے تھے جو بابا کا رنگ ہے ویسا ہی ہونا۔ جو کام کرے بابا کا رنگ رہے تو کرے وگرنہ نہیں۔ یعنی تخلقوا باخلاق اللہ کی زندہ تصویر بن جانا۔ جو دیکھا اس کو دل میں بسالو۔ اسی کی یاد مرو۔ یہی مریدی ہے۔ جب دانہ خاک میں مل جاتا ہے تو گلِ گلزار ہوتا ہے۔

مٹادے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے

کہ دانہ خاک میں مل کر گلِ گلزار ہوتا ہے

اسی وقت خدا پورے طور پر انسان میں آسکتا ہے۔ مرنے سے پہلے مر جانا اگر انسان بننا ہے تو جب اس کا خادم ہو جائے، تب ہی مرنا اس کی یاد میں۔ اپنی جان اس کے اوپر فدا کرنا (اور حقیقتاً انہوں نے اپنی جان فدا کر کے دکھادی تا کہ حضور ابھی درمیان سے رخصت نہ ہوں۔ اس زمانہ سے بہت قبل ہی حضور باباجان نے فرمانا شروع کر دیا تھا۔ کہ اب ہم جاتے ہیں۔ ہمارا کام ختم ہو گیا) رحیم خاں بابا فرماتے تھے اپنی جان ہاتھ میں لے کر پھرنا۔ ذکر کرتے ہوئے رہنا۔ تو کسی نہ کسی کی زبان سے وہ سکھاتا ہی رہتا ہے۔ باباجان اپنی طرف بلا کر یوں نہیں دیتے کہ کسی کو دُکھ کے راستہ پر کیوں ڈالنا، جب تک اس کی خود خواہش نہ ہو۔ خدا بھی راستہ پر نہیں ڈالتا۔ کنزاً محضیاً انا الحق کا راز کھل جاتا ہے۔ ہر بندے کو راستہ میں کیسے ڈالا جاسکتا ہے۔ مولویوں سے ہم جھگڑا نہیں کرتے۔ بس کنارہ کر لیتے ہیں۔ روشنی کی بات ایسی ہے کہ ذکر کرتے ہوئے بڑھ جاتی ہے۔ اس راستہ میں بس 'میں' اور 'تو' ہے۔ جب راستہ پر ڈالا یا تو ساتھ ہی ہوتا ہے۔ پیٹھ کے پیچھے۔ باباجان کا کہا ہوا شعر دہراتے تھے۔

کنتُ کنزاً مخفیاً بے نشاں تو ہی تو ہے

حب ذاتی سے عیاں سرِ نہاں تو ہی تو ہے

اور فرماتے تھے۔ بابا جان کا ارشاد ہے۔ دو ہیں تو میرا۔ تین ہیں تو تیرا۔ اس لئے اس راستہ میں بس 'میں' اور 'تو' ہے اور یہ کہ 'میں' 'تو' ہوا تو میں ہوا۔ ایسی محبت رکھنا دل میں۔ یہ حالت ہو جائے تو ہر ایک میں تو سمایا۔ اور جب تخلقو باخلاق اللہ ہو جائے۔ جب صبغتہ اللہ کا رنگ چڑھ جائے تو پھر بابا جان سے کہو۔

تم کہو لا الٰہ الا اللہ ہوئی کھیلو نگی میں کہہ کر بسم اللہ

الست کی بنی پچکاری الا اللہ کا ہار گندھا

ایسا پیا میرا، ایسا سیاں میرا پیاں پڑو نگی میں پیاں پڑو نگی

اور الا اللہ کی ہوئی کھیل کر بالآخر رحیم خاں بابا حضور کے قدموں میں ہمیشہ کے لئے جا پڑے۔ دائمی حضوری اور دائمی وصال ظاہر و باطن کی ابد الاباد زندگی میں۔

۷۔ شکور بابا (اسحٰق پٹنم والے):

مجاور شکور کہلاتے تھے۔ کیونکہ آخری دور میں حجرہ مبارک کی چابیاں ان کے پاس تھیں۔ چابیوں کی سپردگی سے قبل کا ایک واقعہ وہ بتاتے ہیں کہ رات اشارہ ہوا اور اُٹھ کر حجرۂ مبارک کی طرف چلے۔ دیکھا کہ پٹ کھلے ہوئے ہیں۔ حجرہ مبارک روشن ہے اور در کے آگے ایک شیر ببر لیٹا ہوا ہے۔ جب یہ کچھ اور آگے بڑھے کہ اس کو پھاند کر اندر چلے جائیں تو شیر نے غراتے ہوئے بھاری آواز سے یوں کہا کہ اسے چنڈال تیری اتنی جرأت۔ اس کے بعد اس چنڈال جسم کے فنا کرنے کے لئے جس بھٹی، جس آگ میں انہوں نے جلایا اور یہ جلتے رہے، ان کی آنکھیں گواہی دیتی تھیں آنکھیں کیا تھیں دو شمعیں فروزاں تھیں۔ رونے رلانے کے دن تو پہلے ہی کاٹ چکے تھے۔ ہجر میں دل کی آگ تو ایک کوہ آتش فشاں ہوتی ہے مگر خدا جانے یہ کون سی آگ ہوتی ہے جو آنکھوں میں جلتی ہے۔ لوگ تو کعبتہ اللہ کے غلاف کو چوم کر ہی مطمئن چلے آتے ہیں۔ مگر درونِ کعبہ کس کی رسائی ہوتی ہے۔

شکور بابا کے احوال یوں ہیں کہ اسحٰق پٹنم کے ایک شریف گھرانے کے فرد تھے۔ کچھ دن تک تو کمپائونڈری کرتے رہے۔ مگر دل میں جو ایک نامعلوم کیڑا اکتر تا رہتا تھا وہ بھلا چین سے کب بیٹھنے دیتا۔ وظائف اور عملیات کی طرف رجوع ہوئے اور وہاں بھی

صرف بھانامتی کے تماشے ہی دیکھتے رہے۔ بیزار ہو کر چھوڑ چھاڑ دیا۔ پھر عشق نے کُنڈی کھٹکھٹائی اور اپنی ہی ایک عزیزہ منظور نظر ہوئی۔ مگر جن کی قسمت میں کچھ اور ہوتا ہے بھلا ان کو قیام کہاں نصیب۔ وہ دوشیزہ منظور الٰہی ہو گئی۔ اور ان میں ہجر کی آگ شدت سے بھڑک اُٹھی۔

بشارت میں ایک اور لڑکی دکھائی گئی جس کی صورت بعینہٖ ویسی ہی تھی۔ اس سے شادی کی۔ مگر اس آگ کو کون ٹھنڈا کرے۔ نہ چین نہ قرار۔ ایک دن یہ طے کر کے کہ اس جسم کے جنجال سے چھوٹوں، خودکشی کا ارادہ کیا۔ اور پرچہ لکھ کر تکیہ کے نیچے چھوڑ کر خود چلے۔ راستہ میں کلنگ پٹنم کی مسجد میں رات بسیرا کیا۔ بابا جان کا اُدھر دورہ ہوا۔ ایک خادم کو نشانی بتا کر بھیجا کہ اس رنگ و روپ کا ایک آدمی فلاں مسجد میں ہے اس کو بلا لائو۔ حاضر ہوئے اور ان ہی کے ہو کر رہ گئے۔

تقریباً پندرہ سال تک خدمت میں رہے ہمیشہ بیمار رہتے تھے اور شاکر رہتے تھے۔ اکثر یہ دیکھا گیا کہ کوئی خصوصی مہمان جب خاص ملاقات کے بعد واپس آتے اور ان سے ملتے تو یہ بھی تقریباً وہی باتیں بتاتے جو بابا جان کا حکم ہوتا تھا۔ ہلدی، مرچ اور تیل کا ذکر کسی اور جگہ آچکا ہے۔ ہلدی کی بُو سے انہیں الجھن ہوتی تھی مگر تیل اور سرخ مرچ کی منتہا کی اگر کسی کو تلاش ہو تو ان میں پائی جاتی تھی۔ یہ تیل وہ تیل ہے جو زیتون مبارک کا نچوڑ ہے۔ اور جس سے طاق کا قندیل جلتا رہتا ہے۔ اور یہ سرخ مرچیں وہ جوشِ عشق ہے جس کے تاروں سے بندھے پروانے طواف کرتے ہیں اور اپنی جان، جانِ اولین میں ضم کر دیتے ہیں۔

بابا جان کی خدمت میں کھانا کھلانا ان کے سپرد تھا۔ جس شفقت و محبت سے یہ کھانا کھلاتے تھے کوئی ماں کا دل ہی جانتا ہو گا جو اپنے بچے کو کھلاتی ہو۔ یا کوئی پردہ دار بیوی جو اپنے مالک کو کھلاتی ہو۔ بڑے سخی تھے اور دردمند۔ بابا جان نے وصال سے دو چار سال پہلے ہی ارشاد فرمایا تھا کہ تم جائو اور فلاں جگہ بیٹھو مگر ان کو کسی قیمت بھی جدائی گوارا نہ تھی۔ کوئی اپنا دربار جمانا ان کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتا تھا۔ جب شمسِ حقیقت نصف النہار پر ہو تو کیا کوئی اپنا دیا لئے گھومتا پھرے۔ بڑی شرم کی بات ہوتی ہے۔

بابا جان کے وصال کے بعد مجبوراً ان کو کچھ عرصہ کے لئے دربار چھوڑنا پڑا۔ مگر کب تک۔ ازلی کشش کھینچ لائی اور جہاں کا خمیر تھا اسی خاک میں سپردِ خاک ہوئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

میرے دل میں سما گئے ہیں آپ　　اپنے گھر آج آگئے ہیں آپ

زندگی تھی مری شبِ تاریک　　ماہِ تاباں دکھا گئے ہیں آپ

چھوڑیئے اب یہ سب گلے شکوے
میرا مطلب تو پا گئے ہیں آپ

چونک اٹھتا ہوں نیند میں اکثر
کیسے فتنے جگا گئے ہیں آپ

چاند تاروں میں ڈھونڈتا ہوں میں
کیا ٹھکانا بتا گئے ہیں آپ

رات بھادوں ہے دن کو ساون ہے
بدلیاں بن کے چھا گئے ہیں آپ

دل پہ طاری ہے وجد کا عالم
کیسے نغمے سُنا گئے ہیں آپ

فکرِ امروز نہ ہی غم فردا
نقش ایسا جما گئے ہیں آپ

بھول بیٹھا تھا راستہ دل کا
مجھ کو مجھ سے ملا گئے ہیں آپ

یادِ قادر میں مست رہتا ہوں
جام کیا پلا گئے ہیں آپ

(رحمن بابا)

☆...☆...☆